

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

انسان پر انسان کی خدائی کی یوں تو متعدد صورتیں ہیں مگر اسے قائم کرنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک راستہ یہ ہے کہ خدائی قائم کرنے والا لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرے کہ وہ بعض ایسی خصوصیات کا حامل ہے جن کی بنا پر اسے آثارِ تکبر کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے۔ خدائی قائم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو سب سے پہلے حیوان بنایا جائے، داخلی طور پر اسے منضبط کرنے والے جتنے اخلاقی محرکات ہیں انہیں ختم کیا جائے، اس کے سغلی جذبات کو بھڑکایا جائے اور وہ جب بچھ کر معاشرے کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے لگے اور عوام کے لیے پُر امن طور پر جینا دیکھ کر دسے تو پھر بے رحم قانونی تسکینوں کے ذریعے اسے کسی نظم و ضبط کا پابند بنایا جائے۔

دور جدید کی پوری تاریخ انسان پر انسان کی خدائی کے اسی دوسرے طریقے کے بے شمار شواہد پیش کرتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) نے لوگوں کے افکار و نظریات کے اندر تلاطم پھاڑ کر کے جب ان کے مذہبی جمود کو توڑا تو اسی جنون میں لوگوں نے ان داخلی محرکات کو بھی ختم کر کے کوشش کی جو انسان کو اندر سے کسی ضابطہ اخلاق کا پابند بنائے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حریت افکار کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر چھپی ہوئی حیوانیت بھی بے قابو ہونے لگی۔ اس چیز کو لوگوں نے "آزادی کی برکات" خیال کیا اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات پر غور کرنے کے بجائے اس کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کرنے لگے۔ انہیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ آزادی کس قسم

کے خوفناک نتائج پیدا کرے گی اور مذہب اور روایات کے جن بندھنوں کو توڑنے پر لوگ اُس وقت بڑے خوش نظر آتے تھے وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے بدلے میں انہیں نہ صرف آمرتیت کا تلاءہ اپنی گردنوں میں ڈالنا پڑے گا بلکہ اپنے آپ کو بے شمار قانونی شکنجوں میں کسوا کر زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

انسانی زندگی پر جب ذرا گہری نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر حیوانیت اور روحانیت دونوں اس طرح ایک دوسری میں سموی ہوئی ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ روحانیت یا اخلاقی احساس انسان کی تہذیب کرتا ہے اور اس کی حیوانی قوت کو کسی صحیح راہ پر لگاتا ہے۔ چونکہ انسان کی حیوانی خواہشات پر انسانی بقا کا دارومدار ہے اس لیے ان میں غیر معمولی قوت ودیعت کر دی گئی ہے۔ اب اگر ان قوتوں کو داخلی طور پر اپنی فطری حدود کے اندر رکھنے کا نظام نہ کیا جائے تو یہ سرکش اور باغی ہو کر نہ صرف فرد کی زندگی کو برباد کر دیتی ہیں بلکہ پورے معاشرے کو تہ و بالا کر ڈالتی ہیں۔ اس لیے اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے جکڑنبی ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ آمرانہ جکڑنبیاں ہر اُس نظام کا ناگزیر حصہ ہیں جس کی بنیاد الحاد پر اٹھائی گئی ہو۔ یہ نظام سرمایہ دارانہ جمہوریت ہو، فسطائیت ہو یا اشتراکیت

سطح ہیں انھیں ممکن ہے ان تینوں نظاموں کی جکڑنبیوں میں کوئی نوعی فرق دیکھتی ہوں، مگر حقیقت میں ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ نوعی نہیں بلکہ ارتقاء کی مختلف منازل کا ہے۔ مثلاً جدید سرمایہ داری کے آغاز میں اگرچہ دولت پرستی نے مذہبی اقدار کو انسانوں کی نظر میں بے وزن بنا دیا تھا مگر معاشرے میں سختی و روایات کا احترام کسی حد تک موجود تھا اور شریف لوگ اُن روایات کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے عام انسان اندر سے اتنا بے قابو نہ ہونے پایا تھا جتنا کہ آگے چل کر ہو گیا۔ اخلاقی ضابطہ حیات سے بغاوت کا جو رجحان آغاز میں ابھرا تھا اس نے رفتہ رفتہ اس قدر شدت اختیار کی کہ وہ اپنے ساتھ روایات کو بھی بہا لے گیا۔ لوگوں نے روایات

کو بھی بیکار کی زنجیریں سمجھ کر انہیں توڑنا شروع کیا اور اس طرح پورا معاشرہ ہمہ گیر فساد کی لپیٹ میں آگیا۔ آخر کار یہ محسوس ہونے لگا کہ انسانوں کی اس سرکشی کو فسطائیت کا آہنی نظام ہی روک سکتا ہے، چنانچہ یورپ کے مختلف ممالک میں فسطائیت نے اپنا تسلط قائم کیا۔

یورپ میں مذہب کے خلاف بغاوت کی شدید لہر ریڈیٹنٹسٹ تحریک کی صورت میں نمودار ہوئی۔ عام لوگ اس تحریک کو ایک ایسی مذہبی تحریک خیال کرتے تھے جس کا مقصد رومن کیتھولک مذہب کے جمود کو توڑنا اور اس کے اندر جمع شدہ غلاظتوں کو صاف کرنا تھا۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ ریڈیٹنٹسٹ تحریک اصلاح مذہب کی کوئی تحریک نہیں تھی بلکہ مذہب سے انحراف اور بغاوت کا ایک زبردست رجحان تھا۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے عوام کو مذہب سے برگشتہ کرنے کے لیے وہی حربے اختیار کیے جو عام طور پر اس سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اہل مذہب کے جمود اور ان کی بد اعمالیوں کے افسانے گھڑے گئے اور انہیں بڑی شدت کے ساتھ عوام میں پھیلا دیا گیا۔ پھر حقیقی مذہب کی تعریف کی گئی اور اس کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا جانے لگا اور لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ مذہبی طبقے نے مذہب کی جو حدود و قیود قائم کر رکھی ہیں اور جن اخلاقی پابندیوں کا وہ عوام سے تقاضا کرتا ہے، اصل مذہب کا ان سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ مذہب تو روشن خیالی اور ترقی پسندی کا نام ہے۔ اس لیے روشن خیالی اور ترقی کے نام پر جو کچھ کر لیا جائے وہی مذہب کا مقصد و مدعا ہے۔ اس قسم کی غلط تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ نہ صرف اہل مذہب سے بیزار ہوتے بلکہ مذہب نے ادا مردنوا ہی کا جو نظام قائم کر رکھا تھا اور خیر و شر کے جو پیمانے انسانیت کو دیئے تھے ان سب کے خلاف حقارت کا ایک شدید جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ روایات کی بھی تذلیل ہونے لگی اور لطف کی بات یہ ہے کہ فساد کا یہ سارا اکیلی مذہب کے نام پر کھیلا گیا۔ اصلاح مذہب کی ان تحریکات نے آمریت کو جنم دیا۔ جرمنی میں مارٹن توھر کی تحریک کے نتیجے میں فسطائیت نے جنم لیا اور انگلستان میں یہ سارا کام بادشاہت کی نگرانی

میں سرانجام پایا۔ بادشاہت کے زوال کے بعد جب یورپ کے مختلف ممالک میں جمہوریتیں قائم ہوئیں تو وہ بھی انسان پر انسان کی خدائی کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔ خدا کے بند و بالائے تمام پر وطن اور قوم کو فائز کیا گیا اور لوگوں کو یہ یاد کرانے کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنی زندگی میں اگر فائز المرام ہونا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وطن کی خاطر جنیں اور اسی کی خاطر مریں اور اسی کی سرطوبی کے لیے جدوجہد کریں۔ ظاہر ہے کہ بے جان وطن جس کی حیثیت ایک بت کی سی ہے، خود تو فرمان جاری نہیں کر سکتا۔ یہ فرض وہی لوگ سرانجام دیتے ہیں جو اس بت کے مجاور و محافظ ہوں چنانچہ وطن کی خدمت اور سرطوبی کے نام پر ایک عیار طبقہ عوام پر مسلط ہو گیا اور اس نے اپنی خدائی کا سکہ چلانا شروع کیا۔ انسان کے بنائے ہوئے ضابطوں کو تقدس کا وہ مقام حاصل ہو گیا جو خدا کے دیئے ہوئے قوانین کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر وطن کی خدائی بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ ذرائع نقل و حمل کی حیرت انگیز ترقی نے دنیا کے دور دراز گوشوں کو سمیٹ کر ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ اس سے وطنیت کے تعصبات اور اتبیا زات ماند پڑنے لگے اور اس بت میں خدائی کی جو کشش پیدا کی گئی تھی وہ کمزور ہونے لگی۔ دوسری طرف اخلاقی احساسات کے ختم ہونے سے انسان روز بروز بے قابو ہوتا چلا گیا۔ پہلے تو وہ اپنی انفرادی زندگی میں اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوا پھر اس نے اجتماعی زندگی میں ایک ایسی مجبوزاتہ روش اختیار کی جس سے معاشرے میں زبردست بگاڑ پیدا ہوا اور آہستہ آہستہ ایسے مسائل پیدا ہو گئے جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جب تک اجتماعی زندگی کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ جکڑا نہیں جاتا اس وقت تک اس معاشرے کا نظم و ضبط قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی نئی صورت حال نے اشتراکیت اور اس کی بے رحمانہ حکم بند یوں کو جنم دیا۔ اخلاقی احساسات کے بغیر انسان محض ایک حیوانِ ناطق ہے۔ حیوان کے لیے تین ہی مسائل ہوتے ہیں۔ مشقت کرنا، پیٹ بھرنے اور تناسل کے سلسلے کو قائم رکھنا۔ اس لیے اسے کسی ضابطے کا پابند بنانے کا یہی آسان راستہ

ہے کہ رب بن کر انسان کے رزق کو کنٹرول کر لیا جائے۔ اس کنٹرول سے اس کی پوری زندگی کو جکڑا جا سکتا ہے۔ یہی طریقہ اشتراکیت نے اختیار کیا ہے۔

یورپ میں تو ان چاروں منازل سے گزرنے کے لیے اہل یورپ کو تین سو برس لگے ہیں مگر ہمارے ہاں الحاد کی تحریک اس شدت سے اٹھاتی گئی ہے کہ ۲۳ سالوں میں ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری نوجوان نسلیں اس حد تک بے قابو ہو گئیں کہ بڑے سنجیدہ لوگ اس پہنچ پر سوچنے لگے ہیں کہ کیا اشتراکیت کی جکڑ بندیوں کے سوا ہمیں کوئی دوسرا قانون یا ضابطہ اخلاق بھی انتشار سے بچا سکتا ہے؟ اب فراویں سے انحراف کی ان مختلف منازل پر نگاہ ڈالیے جن کے نتیجے میں اشتراکیت کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

پاکستان دین کی اساس پر معرض وجود میں آیا اور دینی جذبے سے سرشار ہو کر ہی عوام نے اس کے لیے قربانیاں دیں۔ اس وقت جبکہ عوام کے دینی جذبات و احساسات عروج پر تھے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ ملک کا آئین جلد از جلد قرآن و سنت کی بنیاد پر تیار کر کے اُسے ملک میں رائج کر دیا جاتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ ملک کی عام آبادی کا ذہن کیسو ہو جاتا۔ لوگوں کے اخلاقی احساسات، ان کی ملی روایات اور معاشرتی و ملکی ضابطوں کے درمیان کامل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی اور قوم جلد از جلد ترقی کرتی۔ مگر یہ معقول، منصفانہ اور تعمیری طرز عمل اختیار کرنے کے بجائے اسلامی آئین کی راہ میں مختلف روڑے اٹکائے گئے اور لادینی قوتوں کی پوری طرح ہمت افزائی کی گئی تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں دین کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ انتشار پیدا کیا جائے۔ اس ضمن میں خاص طور پر ملاحظہ فرمائیے کہ بدلتے ہوئے تقیید بنایا گیا۔ اس کی جہالت، کم علمی اور دورِ حاضر کے مسائل سے اس کی عدم واقفیت کے عجیب و غریب افسانے تراشے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کی آراء دین میں وزن رکھتی ہیں انہیں مسلم سوسائٹی میں بے وزن بنا دیا جائے اور ان کی جگہ ان لوگوں کو اُبھارا جائے جو جاہل ہونے کے باوجود مجتہد ہونے کے دعویدار

ہوں اور دین کے اندران کی تعریفیات کو اچھا لاجاتے اور سرکاری طور پر ان کی پذیرائی کی جاتے ہیں کام کو بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سرانجام دیا گیا۔ اگر ان باہل مجتہدین کی تحقیقات پر غور کیا جائے تو ان سب کا انداز ایک ہے۔ سب سے پہلے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اہل مغرب اس وقت جس راہ پر گامزن ہیں وہی سلامتی کی راہ ہے اور اسی راہ پر چل کر کوئی قوم فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ہمیں بھی مغرب کے معیار ترقی کو اپنانا چاہیے۔ پھر اس ضمن میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ سب ”ملا“ کی تنگ نظری اور تعصب کے نتائج ہیں، ورنہ اللہ کا دین بھلا عصر جدید کے افکار و نظریات سے کس طرح متصادم ہو سکتا ہے؟ اس باطل خیال کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا جاتا ہے کیونکہ سنت ہی سے ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے وہ ڈھانچے ملتے ہیں جنہیں قرآنی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویریں کہا جاسکتا ہے۔ سنت سے انحراف کے بعد قرآن مجید کی من مانی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور کلامِ الہی میں تدبر و تفکر کے نام پر ایسے غلط افکار و نظریات کو پیش کیا جاتا ہے جو تعلیماتِ الہی کی عین سند ہیں۔ کہیں قرآن مجید سے سو دکان جواز نکالا جا رہا ہے۔ کہیں موسیقی اور ریت تراشی کے لیے دلائل فراہم کیے جاتے ہیں۔ کہیں ناماندی منصوبہ بندی کی تائید کے لیے آیاتِ قرآنی کا حلیہ بھڑا جا رہا ہے۔ العزیز تمام وہ بُرائیاں جو مغربی دنیا میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں انہیں کسی نہ کسی طرح قرآن مجید سے ثابت کرنے کی کوشش کا نام ان لوگوں کے نزدیک تحقیق اور خدمتِ دین ہے۔

اس طرز فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان نسلوں نے اپنے آپ کو دین کے مطابق ڈھاننے کے بجائے دین کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھاننے کی کوشش کی بعض سادہ لوح دین کے معاملے میں اس قسم کے انکشافات کو دین کی خدمت خیال کرتے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اس اندازِ فکر سے کسی معاشرے کے اندر الحاد پرورش پاتا ہے جب اس معریتیت کے انداز پر غور و فکر کرنے والے مفکرین نوجوان نسل کے دل و دماغ میں یہ تاثر بجاتے ہیں کہ ترقی اور روشن خیالی کا اصل معیار تو وہی ہے جو مغرب نے دنیا کو دیا ہے اور ہم انہی

معیار کو اپنا کر دنیا میں سر ملید ہو سکتے ہیں اور اس معیار کو درست ثابت کرنے کے لیے وہ قرآن مجید میں من مانی تاویلات بلکہ تحریفیات کرنے میں متامل نہیں ہوتے تو نوجوانوں کے ذہنوں میں فطری طور پر یہ احساس پیدا ہو گا کہ کیوں اصل معیار کو اپنا لیا جائے اور نبی دین کے اندر قدم قدم پر افسیر و تبدل کی ہر ذرت پیش آرہی ہے اُسے کیسے چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ دیکھیے کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اسلامِ مذہب اور تجدید دین کا یہ انداز اختیار کیا گیا وہاں لوگوں کے اندر دین سے محبت اور رغبت کا رجحان پیدا ہونے کے بجائے انحراف اور اجابت کا رجحان پیدا ہوا۔ یورپ میں مارٹن لوتھر کی تحریک اسلامِ مذہب سے الحاد کو فروغ حاصل ہوا اور ہمارے ہاں اس قسم کی "تحقیقاتی" سرگرمیوں سے نوجوان مذہب سے برگشتہ ہوئے۔

یہاں ایک طرف تو عوام خصوصاً نوجوان نسلوں کو مذہب سے بیگانہ بنانے کی سازشیں ہوتی رہیں اور دوسری طرف اس امر کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا رہا کہ انہیں انسانی حدود و قیود سے آزاد کیا جائے اور اسلام نے سیرت و کردار، ضبط نفس، عفت اور پاکدامنی کی جو درشاں رعایات قائم کی ہیں ان کے خلاف نفرت و حسرت کا عام رجحان پیدا کیا جائے۔ چنانچہ انسانی حدود اور ضبط نفس کو انسان پر بے جا دباؤ اور عفت و پاکدامنی کو تاریک خیالی سے تعبیر کیا جانے لگا۔ پھر اسلام نے تقویٰ اور پرہیزگاری کے جو اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں ان کی عیب جوتی میں اور اقسامیہ کیے جانے لگے تاکہ ان حضرات کے لیے مسلم معاشرے میں جو بذبہ اترام موجود ہے وہ کم ہو اور وہ مغربی تصور کے مطابق یہ سمجھنے لگیں کہ انسان فطری طور پر گناہگار ہی ہے مگر اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ خدا خونی اور خدا ترسی کی نمائش کرتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں انسان کی سرشت کے بارے میں ترقی پسندوں نے جس قدر انسانے لکھے ہیں ان میں انسان کی اس "مناقت" کو نمایاں کیا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر انسان اندر سے شیطان ہوتا ہے اور وہ حسن عوام کو دھوکہ دینے اور انہیں بیوقوف بنانے کے لیے پرہیزگاری کا رُپ دھارتا ہے۔ اس لیے بہتر

یہی ہے کہ ظاہر داری کے سارے پردے چاک کر کے اور ہر قسم کے خوف سے بے پروا ہو کر انسان کھل کر اپنے سفلی جذبات کی تسکین کرے کیونکہ اس آزاد طرز عمل سے ہی انسانی شخصیت کی بہتر طور پر تشکیل ہو سکتی ہے۔

ان جدید مفکرین "اورڈانشورون" نے مغربی فلاسفہ کی اندھی تقلید میں اس سادہ سی حقیقت پر غور کرنے سے انکار کر دیا کہ انسان کو فطری طور پر گنہگار قرار دینے اور اس سے بھول چوک میں گناہ منزد ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ اہل مغرب کے ہاں انسان کے بارے میں جو تصور رائج ہے اور جس کی بنیاد پر اس کے لیے اخلاقی اور سیاسی ضابطے مرتب ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کے انکار کے سرچشمے اور عمل کے محرکات فطری طور پر سفلی اور مادی ہیں، اس بنا پر وہ جب نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ درحقیقت ایک طمع سازی ہوتی ہے کیونکہ یہ طرز عمل اُس کی اصل فطرت کے خلاف ہے اس لیے جو ضابطہ حیات اُسے نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ آزادی دے وہی صحیح اور فطرت انسانی کے قریب ہے۔ اسلام کا اساسی تصور انسان کے بارے میں اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیک اور ایمین سمجھتا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ انسان سے معاملہ کرتا ہے کہ اگر اُسے پاکیزہ ماحول اور اچھی تربیت میسر آجائے تو وہ شیطان بننے کے بجائے بندہ رحمان ہوگا۔ اگر اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو یہ اس کی فطرت کا خاصہ نہیں بلکہ اتفاقی لغزش ہے جس کے از تکاب سے اُس کے اندر خلش پیدا ہوتی ہے اور اس کا ضمیر بوجھ محسوس کرتا ہے۔ اس خلش کو محسوس کر کے وہ اپنی اصلاح کے لیے کوشش کرے تو وہ اپنے اخلاق کو زیادہ سے زیادہ بلندی تک لے جا سکتا ہے۔

انسان کے بارے میں ان دو مختلف نظریات کی وجہ سے جو اجتماعی نظام تشکیل پاتے ہیں وہ بھی بنیادی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً جو نظام انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیک اور قابل اعتماد

سمجھتا ہے وہ اس کی فطرت اور اس کے مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوتا بلکہ برابر اصلاح کے لیے کوشاں رہتا ہے اور اصلاح کے معاملے میں بھی قانونی گرفت پر زیادہ انحصار کرنے کے بجائے تہذیبِ باطن اور تعلیم و تربیت پر زیادہ زور دیتا ہے، کیونکہ اندر کا انسان جیت تک مہذب اور اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں ہو جاتا خارجی پابندیاں زیادہ موثر ثابت نہیں ہو سکتیں۔ مگر جو لوگ انسان کو فطری طور پر گناہگار اور ناقابلِ اعتماد حیوان سمجھتے ہیں ان کا زیادہ زور قانونی جکڑ بندیوں اور بے رحم ضوابط پر ہوتا ہے اور وہ ان کی مدد سے ہی انسان کو اجتماعی زندگی کا پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کے فطری طور پر گناہگار ہونے کے تصور کی اگرچہ اسلام پوری طرح نفی کرتا ہے مگر قسمتی سے یہاں کے باشندوں کے ساتھ گزشتہ بیس سالوں میں جو سلوک کیا گیا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قومی معاملات کو چلانے والے اسی تصور کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ مغرب کی بھونڈی نقالی ہے جس کے ذریعے ہماری نوجوان نسلیں مغربی افکار و نظریات کی تربیت پاتی ہیں اور وہ انسان کے بارے میں وہی عقیدہ لے کر جوان ہوتی ہیں جو اہل یورپ کا ہے کہ انسان محض ایک حیوان ہے اور اس کے لیے نفس و جسم کی خواہشات کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس تصور کی بنا پر انسان کو اجتماعی زندگی کا پابند بنانے کی صرف یہی ایک صورت ممکن سمجھی گئی ہے کہ ایک طرف تو اس کے لیے پے پے چارے کا انتظام کیا جائے اور دوسری طرف سفلی جذبات کی تسکین کی اُسے پوری پوری آزادی مہیا کی جائے تاکہ وہ اس مادی زندگی سے لطف اندوز ہو سکے۔ چنانچہ شروع ہی سے ہمارے ہاں سیاسی اور معاشی میدان میں دو واضح رجحانات ملتے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت سارے کام ڈنڈے کے زور سے کرے اور افراد کسی معاملے میں اپنے آپ پر کوئی ذمہ داری محسوس نہ کریں۔ حکومت اگر لوگوں کی فلاح و بہبود کی ممتنی ہے تو اُسے چاہیے کہ ملک کے اندر شدید قسم کی جکڑ بندیوں کے ذریعہ اس مقدس فرض کو سرانجام دے، کیونکہ اگر معاملہ انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تو وہ لازمی طور پر تخریبی کارروائیاں ہی کریں گے۔ دوسرے

ملک کے معاشی حالات کی بہتری کی بھی کوئی صورت بجز اس کے ممکن نہیں کہ ملک کے ذرائع و وسائل براہ راست حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور وہ خود پیدائش دولت اور تقسیم دولت کا انتظام کرے، کیونکہ عام انسانی آبادی کو اگر اس معاملے میں آزادی دی گئی تو ملک میں منصفانہ تقسیم دولت کے بجائے چھین چھپٹ کا بازار گرم ہوگا اور کمزور طبقوں کے ساتھ سخت نا انصافی ہوگی۔

ہم اس وقت اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ یہ منطق کس قدر غلط ہے اور اس میں کیا کیا فکری لغزشیں ہیں اور یہ طرز استدلال جن مفروضات پر قائم ہے وہ کس قدر بوجہ اور حقیقت سے دور ہیں۔ مثلاً یہ دعویٰ آخر کس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ وہی انسان جو اپنی انفرادی زندگی میں سخت جریں لالچی اور بندہ نفس ہوں گے انہیں جب اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے اقتدار کی باگیں سونپ دی جائیں گی تو وہ انصاف اور بے غرضی کے پیکر بن جائیں گے اور اقتدار کا نشہ ان میں تکبر اور خود غرضی پیدا کرنے کے بجائے انکسار اور بے نفسی کو جنم دے گا؟ ہم فی الحال ان سب پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کس قسم کے غلط رجحانات پیدا ہو گئے ہیں اور انہوں نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کس قسم کے تباہ کن نتائج مرتب کیے ہیں۔

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر سب سے زبردست نقصان یہ پہنچا ہے کہ اسلام جو ہماری زندگی کی واحد اساس ہے وہ بازیچہ اطفال بن کر رہ گیا ہے۔ دوپارہ انفرادی ہزاروں کو چھوڑ کر پوری مسلم آبادی زبان سے تو یہی اقرار کرتی ہے کہ اسلام ہی صحیح اور مکمل شاہد حیات ہے مگر اس زبانی اقرار کے باوجود ہم فلاح و کامرانی کے لیے دوسرے نظاموں کی طرف دیکھتے ہیں اور انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ہماری زندگی میں جو یہ خوفناک تضاد پیدا ہو گیا ہے اس نے ہماری تعمیری قوتوں کو بالکل منسلوج کر کے رکھ دیا ہے اور اس سے ہمارے اندر نفاق کا ایسا مرض پیدا ہو گیا ہے جس کی اصلاح کی کوئی صورت بجز اس کے نظر نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ غیب سے اس کا کوئی انتظام کر دے۔ اسلام کی مظلومیت کا یہ عالم ہے کہ خالص مادہ پرستانہ نظریات اور سو فیصد غیر اسلامی نظائے حیات کے علمبردار اسلام کے

نام پر اپنے ان خرافات کا پرچار کرتے پھرتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام کے نام پر اب کفر کی علانیہ اشاعت کی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال اس قدر افسوسناک ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس منافقت کے ساتھ آج تک دنیا میں کسی قوم کو ابھرتے بلکہ ابھرتا تو کیا زندہ رہتے نہیں دیکھا گیا۔ یہ منافقت جب کسی قوم میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر اُسے دیکھ کی طرح پاٹ لیتی ہے۔

دوسرا بڑا نقصان ہمیں یہ پہنچا ہے کہ ہماری قوم کے دل و دماغ میں یاس و قنوطیت چھا گئی ہے۔ وہ اپنے آپ سے، اپنے ماضی سے، اپنی قیادت سے، اپنے مستقبل سے بیزار معلوم ہوتی ہے۔ اس چیز نے اس کے اندر نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کر دیئے ہیں اور اُس کی خود اعتمادی کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اُسے نہ تو اپنے آپ پر اعتماد باقی رہا ہے اور نہ کسی دوسرے پر اعتماد کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو آمادہ پاتی ہے۔ آپ کسی شخص سے بات کر کے دیکھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ہر فرد وہاں بیزار بیٹھا ہے۔ عوام اس مرض کو معمولی سمجھتے ہیں حالانکہ اجتماعی نقطہ نظر سے یہ بڑا خوفناک مرض ہے جس سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان دل لگا کر کوئی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر کام کو بیگار سمجھ کر تا ہے، ہر دوسرے آدمی کو بے ایمان سمجھتے ہوئے اس سے معاملہ کرتا ہے اور خود بھی تخریب پسندانہ ذہنیت کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اُس کے اندر نہ کوئی تعمیری جذبہ باقی رہتا ہے نہ کوئی تعمیری قوت۔ اور دوسرا اثر اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر فطری طور پر یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا اس کے لیے ہر کام کرے مگر وہ کسی کے لیے کچھ نہ کرے۔ یہی چیز اس کے اندر ایک آمرانہ نظام کی طلب اور اسے قبول کرنے کی کمزوری پیدا کر دیتی ہے، کیونکہ آمریت کی قوت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس کا دائرہ اختیار بھی وسیع ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ صرف یہ وسیع اختیارات رکھنے والی طاقت ہی اُس کی زندگی کو بہتر اور شاد کام بنا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں آمرانہ مزاج رکھنے والے افراد کے جو اس قدر حوصلے بڑھے ہیں کہ وہ عوام کی نشا اور مرضی کے علی الرغم تحت اقتدار

(باقی صفحہ ۱۲۱ پر)